Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 4, Issue 2
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

**کوثر پروین**
اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو، نمل اسلام آباد
**ڈاکٹر شفیق انجم**
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو نمل اسلام آباد

# اصلاح نسواں کے تناظر میں نذر سجاد کے ناولوں میں صنفی تصورات

**Kausar Parveen**
Scholar Ph.D Urdu, Numl Islamabad
**Dr. Shafiq Anjum**
Associate Professor, Department of Urdu, Numll Islamabad

## Gender Concepts In The Novels of Nazar Sajjad In The Context Of Feminist Reform

Thousands of years ago, system "Madr sari" system was prevalent. Women used to live independent life. Modern agricultural system introduced "Padar.shahi" system which changed the whole situation and women became subjugated and negligible, which placed them in defiance of the historical powder and dominance under the British Rule women were granted some of basic rights giving rise to their recognition in the society. The authors including female writers presented women as a subject of their novels. One of the female writers of that era is Nazar Sajjad Haider who presented the concept of modern and independent women with bravely.She is the mother of Qrat u lain Haider. She emphasized over the issues such as modern and higher education for the women, important of women consent at the time of marriage and men' s right of second marriage, in her writings . This research work will analyze the social position of women under the novels of Nazar Sajjad Haider. She was practically a feminist who fought against the old fashioned and feudal prevalent traditions of her time.

**Keywords**: Agricultural revolution , Madrasari system ,Patriarchy , a generation of prejudice, Trans gender r, Early marriage ,Theveli, Missionary school ,Modern education, Reform movements ,second marriage ,unnecessary freedom, autonomy

**کلیدی الفاظ**: زرعی انقلاب، مدر سری نظام، پدر شاہی، نسلی تعصب، خواجہ سرا، ستی، کم عمری کی شادی، پردہ، چار دیواری، مشنری اسکول، جدید تعلیم، اصلاحی تحریکیں، دوسری شادی، بے جا آزادی، تنہا زندگی، خود مختاری۔

ہزاروں سال پہلے معاشرہ مادر سری نظام کے زیر تسلط تھا جس میں عورت طاقت و اختیارات کا منبع و مرکز تھی۔اس نظام میں عورت ہی قبیلے کی سردار ہوتی تھی اور زراعت سے

عورت کی گہری وابستگی کی بناءپر ہ سے فصلوں کی کٹائی کی دیوی سمجھا جاتا تھا۔ عورت کی نسل انسانی کی افزائش و تولید میں مرکزی حیثیت اور زراعت سے گہری وآبستگی کی وجہ سے اسے مرد کے مقابلہ میں زیادہ حقوق حاصل تھے۔ مال اور اولاد دونوں پہ اس کی ملکیت مسلم تھی۔ انسانی معاشرے پہ مادر سری نظام کا تسلط کب تک قائم رہا، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ہاں البتہ یہ بات قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مارگن اور مارکس کا نظریہ ظہور زرعی شعبے میں ترقی کے بعد ہوا اور اس زرعی ترقی نے معاشرئے پر عورت کی گرفت کو کمزور اور مرد کے تسلط کو استحکام بخشنے میں بنیادی کردار ادا کیا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زرعی انقلاب معاشرے پر عورت کی حاکمیت و تسلط کے زوال کا باعث بنا اور اس کی حاکمیت محکومیت میں بدل گئی۔ عورت جو مادر سری نظام میں سربراہ کی حیثیت رکھتی تھی پدر سری نظام میں ملازمہ و نوکرانی بن گئی اور جانوروں کی طرح اسے فروخت کیا جانے لگا۔ محلوں کی رانی محلوں کی کنیز کا روپ پیش کرنے لگی اور اس کی پہرے داری کے لیے خواجہ سراوں کو مامور کیا جانے لگا۔ مذہبی طور پر اسے کہیں تو داشتا بنایا گیا تو کہیں وہ طوائف کہا گیا۔ اور تو اور زروزمین کی طرح اسے بھی فساد کی جڑ قرار دیا گیا۔ سمیر اور بابل میں حرام کاری کے سلسلے میں طوائف کا کردار سامنے آیا اور عبادات کے سلسلے میں فحاشی کو لازمی جز بنایا گیا۔ روپیہ لے کر خود کو مردوں کے حوالے کر دینا کوئی معیوب بات نہ تھی مندروں کی دیوداسیاں تاریخ کی پہلی طوائف تھیں۔ یوں مرد نے عورت کے تین کردار تشکیل دیئے گئے بیوی، دیوداسی اور طوائف۔ اگر مرد کسی عورت کو نام دے تو بیوی، اپنے حصار میں رکھے تو داشتا اور آزادی دے تو طوائف کہلاتی ہے۔ بت مذہب کے بعد طوائف کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ دہلی کے زوال کے ساتھ اودھ کی حکومت کو بام عروج ملا۔ لکھنوی تہذیب میں اخلاقی انحطاط زیادہ تھا۔ مغلیہ دور میں عورت کی حالت کچھ بہتر تھی مگر وہ مذہبی تعلیمات اور ہندوانہ رسم ورواج کے نیچے دب چکی تھی۔ اس دور میں عورت کو مذہبی حوالے سے دیکھا جاتا تھا اور اس کی زندگی کا محور و مرکز اس کا شوہر تھا جس کی فرماں برداری نہ صرف ساری زندگی کرتی تھی بلکہ اس کی موت پر خود کو جلتی ہوئی آگ میں خود کود دھکیل کر (ستی) اپنی وفا کو بام عروج بخشتی تھی۔ اگر وہ ستی ہونا پسند نہ کرتی تو وہ زبردستی آگ کا ایندھن بنادی جاتی تھی۔ اس بارے میں ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب "عورت اور تاریخ" میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں عورت کی حیثیت اور بھی پس ماندہ تھی اور وہ اس حد تک مرد کے تابع اور اس کے زیر اثر تھی کہ ستی ہونا عورت کے لیے وفاداری، پاک بازی اور نیکی کی علامت بن گیا تھا"(1)

یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا چلن عام ہوا تو اسلامی تہذیب و ثقافت بھی ان ہندوانہ رسم ورواج کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ہندوستان میں نمو پانے والی اسلامی تہذیب و ثقافت میں طلاق یافتہ اور بیوہ سے بدسلوکی کے معاشرتی رویے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں بیوہ کا ساری عمر سفید لباس پہننا دراصل ہندو تہذیب کی رسم ستی ہی کی قدر مہذب شکل ہے۔ دوسری طرف مسلم سماج کی ایک ہزار سال پرانی تاریخ میں کہیں بھی عورت کا ذکر نہیں ملتا اگر ہے بھی تو شاہی خاندان کی حد تک محدود ہے۔ مغلیہ عہد میں محل کا بڑا حصہ شاہی عورتوں کے قبضے میں تھا جسے بادشاہ منظم کرواتے تھے۔ رانیوں کے ذاتی کمرے سجائے جاتے تھے ہر عورت کا الگ مکان ہوتا تھا، داشتاؤں کے بھی الگ گھر تھے۔ سترھویں صدی میں آدھی سے زیادہ اسلامی دنیا کی آبادی حرم سرا میں مقید تھی۔ تاریخی میں ان عورتوں کو نقاب پوش اور زرخرید کنیز کے نام دیئے گئے۔ ان کی ٹوہ لگانے کے لیے خواجہ سرا معمور کیے جاتے۔ نافرمانی کی کڑی سزاءیں دی جاتیں۔ مسلم حکمرانوں کے عہد میں عام عورتوں کے لیے تعلیمی انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے اور ان کی تعلیم کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ قبل از وقت شادی کے رواج کی وجہ سے ان کی پڑھائی نامکمل رہ جاتی تھی۔ مسلمان اور ہندو عورتیں پردہ کرتیں جو عزت و عصمت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں عورتوں سے پردہ کرتی تھیں اور چاردیواری کی حد تک مقید تھیں۔ معمولی گھریلو تعلیم کے بعد کم عمری میں ہی سسرال کی ذمہ داریاں نبھاتی تھی۔ کم عمری میں شادی کا عام چلن تھا جو والدین اور بزرگوں کی مرضی سے طے پاتی تھیں۔ یہ مرضی عورتوں ہی نہیں مردوں پر بھی مسلط کی جاتی۔ جہیز شادی کے لیے ضروری تھا اور جہیز کی کمی و زیادتی ہی عورت کا مقام و مرتبہ متعین کرتی تھی۔ ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج تھا۔ کم عمری کی شادی کے بعد اگر شوہر کی وفات ہو جائے تو ساری عمر کرب اور اذیت میں بھی عورت ہی گزرتی تھی۔ ایسے معاشرتی ڈھانچے کی حقیقت کو آشکار کرتے ہوئے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں: "ایسے معاشرے میں جہاں مرد کو بھی پورے حقوق حاصل نہ ہوں وہاں عورت کی ہستی کیوں کر صحیح مقام کی حقدار قرار دی جاسکتی ہے"(2)

چند ہندوستانی ملکاؤں اور رانیوں کے علاوہ باقی کی تمام عورتوں نے خود کو گھر کی چاردیواری کے اندر بند کر لیا تھا وہ قید و بند کی زندگی گزر رہی تھیں۔ ان کو اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کی اجازت نہ تھی۔ گھریلو زندگی میں ہی ان کی عمر تمام ہو جاتی۔ اٹھارویں صدی سے لے کر 1857ء تک کا دور برطانوی عہد کا دور تھا۔ انگریز ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ کیے جانے والے ناروا سلوک کو دیکھ کر بہت مایوس ہوئے۔ انہوں نے برطانوی عہد کے تحت پرانے اداروں اور قوانین کو رد کر دیا گیا اور نئے عہد کے طور پر مرد/خواتین کو

برابر رسمی تعلیم کے مواقع دیئے۔نو آبادیاتی نظام میں عورت کی تعلیمی ضرورت واہمیت کے بارے میں ڈاکٹر وہاب اشرفی لکھتے ہیں :"انگریزوں نے محسوس کیا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کی بھی تعلیم کا کچھ نہ کچھ انتظام ہونا چاہیے اور اس معاملے میں وہ امانت دار بھی تھے "(3)

یہی دور دراصل تعلیم نسواں کی تحریک کا دور ثابت ہوا۔ڈاکٹر روش ندیم کی کتاب "منٹو کی عورتیں" کے مطابق:"1833ء میں اوبرلن کالج نے پہلی مرتبہ تعلیم نسواں کا آغاز کیا۔"(4) مشنری اسکولوں کے تحت نئے اسکول، کالج اور ایک یونی ورسٹی بنائی گئی۔طالب علموں کو پرائیویٹ امتحان دینے کی سہولت میسر آئی۔آہستہ آہستہ تعلیم نسواں کی تحریک نے اصلاح نسواں کی شکل اختیار کی۔انجمن یو۔پی نے اصلاحی تحریکوں پر انعامات دینے کا اعلان کیا جس کے تحت خواتین کے لیے بیسوں کتابیں شائع ہوئیں۔جن میں ڈپٹی نذیر احمد کی "مراۃ العروس"،"بنات النعش"، مولانا الطاف حسین حالی کی "مناجات بیوہ" اور "مجالس النساء" شامل ہیں۔خواتین کے لیے بہت سے ادبی رسائل کا بھی اجراء ہوا۔اسی تحریک کے تحت سیاسی حلقوں میں خاندان، مذہب اور ملازمت کے دوران ہونے والے استحصالی رویوں کی مزاحمت کی گئی۔انگریزی ذریعہ تعلیم کی وجہ سے عورت کے حوالے سے برصغیر کے مسلمانوں میں تین قسم کے تصوراتی مکتبہ فکر کے حامل افراد پائے جاتے تھے۔

1۔یہ طبقہ انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کا حامی بھی تھا۔اس طبقہ کے نمائندہ افراد میں جسٹس کرامت حسین، شیخ محمد عبداللہ، حالی، شبلی، مولوی ممتاز حسین ہیں۔

2۔دوسرا طبقہ مغربی تعلیم کی حمایت میں تو تھا مگر حقوق نسواں کا حامی نہ تھا جن میں سرسید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، وقار الملک اور اکبر الہ آبادی شامل تھے۔

3۔یہ طبقہ مکمل طور پر مغربی تعلیم اور جدید تمدن کے خلاف تھے انہوں نے تعلیم نسواں کی بھی کھل کر مخالفت کی اور اس تحریک کے حامی افراد پر کفر کے فتوے لگائے جن میں مذہبی علماء بھی شامل ہیں۔

اصلاح نسواں کے حامی پہلے طبقے میں امراء مرد وخواتین دونوں شریک تھے جن میں شیخ محمد عبداللہ، جسٹس کرامت حسین نے تعلیم کو عام کرنے کے لیے تعلیمی ادارے کھولے ۔ان کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔دوسرے طبقے کے اصلاح کرنے والوں کا مقصد پدرسری اور طبقاتی نظام کو فروغ دینا تھا نہ کہ عورت کو خود مختار بنانا۔اسی لیے ڈپٹی نذیر احمد عورتوں کو گھریلو اور دینی تعلیم دینے کے حق میں تھے تاکہ عورت ان کی محبوب خاتون خانہ کا کردار ادا کر سکے۔اکبر کا بھی یہ ہی نظریہ تھا اس سے پدرشاہی کی قائم کردہ نسوانیت قائم رہتی ہے۔اسی نظریے کے تحت روایتی سائنسی اور دنیاوی تعلیم میں رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے۔اسی لیے روبینہ سہگل اپنی کتاب "قوم پرستی، عسکریت اور صنفی تصورات" میں لکھتی ہیں:

"جدید تعلیم میں آزادی اور برابری کے تصورات مسلمان معاشرے اور خاص طور پر خاندان کے لیے خطرناک تصور کیے جاتے ہیں، چنانچہ مسلمان قوم پرستوں نے تہیہ کر لیا کہ اگر مسلمان عورتوں کو تعلیم دینا ہے تو اس کے مواد پر مکمل قابو ہونا چاہیے "(5)

1857 سے لے کر 1900ء ویں صدی کا دور مولوی نذیر احمد اور ان کے معاصرین کا دور ہے۔اس دور میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں جن میں صنفی اور سرمایہ دار تہذیب کا آغاز ہوا۔اسی عہد کو اصلاح کا دور کہا جاتا ہے کیوں کہ اسی دور میں مختلف قسم کی اصلاحی تحریکات نے سر اٹھایا۔حملہ آور قوم نے علاقائی لوگوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔نسائی تحریک کا یہ پہلا دور اصلاحی دور تھا جو مراعات یافتہ مرد/خواتین طبقات تک محدود تھا جس کا مقصد ہندوستان کے فرسودہ اور خطرناک رسم ورواج کی طرف توجہ مبذول کروا کر ان کا خاتمہ کرنا تھا جن میں بچپن کی شادی، بیوہ کی شادی کی ممانعت، ستی، عورتوں کی تعلیم اور حق وارثت سے محرومی اور مردوں کی ایک سے زائد شادی کی حمایت شامل ہے۔ان رسم ورواج کی وجہ سے خاندان جیسے بڑے ادارے کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔بے سہارا عورتوں کی بڑی تعداد قحبہ خانوں کو آباد کر رہی تھی۔تعلیم نسواں کی وجہ سے عورتوں کے اندر شعور ذات پیدا ہو رہا تھا جس سے وہ ایک ذمہ دار شہری کے فرائض سرانجام دے سکتی تھیں۔اس تحریک کے ابتدائی رہنماؤں میں رام موہن رائے، راجندر ناتھ، ودیاساگر اور سرسید احمد خان کے رفقاء شامل تھے۔

یہ تشکیلی اور اصلاحی معاشرت کا دور کہلاتا ہے۔اسی دور میں اصلاحی ادب لکھنے کا رجحان پیدا ہوا جس میں مرد ادیبوں کے ساتھ ساتھ چند خواتین ادباء بھی شامل تھیں۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی عورت مولانا اشرف علی تھانوی کی سوچ کا پرچار کرتی نظر آتی ہے جس میں شوہر کی تابع داری کو ایک اچھی بیوی کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے، راشد الخیری کی عورت اپنی مظلومیت کے آنسو بہاتی اور دوسروں کی ہمدردیاں سمیٹنے کی طلب گار نظر آتی تھی۔عبدالحلیم شرر کی عورت بہت معصوم اور حساس ہے جو تنہا زندگی نہیں گزار سکتی۔

1900ءویں صدی سے 1936ءتک کا دور ترقی پسند تحریک کے تحت حقیقت نگاری کا دور ہے جس کے نمائندہ مصنف پریم چند تھا۔ یہ دور حقیقی زندگی کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ نئے خیالات اور رجحانات کا بھی ترجمان تھا۔ پریم چند کی عورت حقیقت نگاری کی تلخی کو برداشت نہ کرتے ہوئے مجبور اور لاچار نظر آتی ہے۔ یوں یہ مرد ادیب ایک مضبوط اور خوددار عورت کا کردار سامنے لاتے نظر نہیں آتے بلکہ بقول شمس الرحمان فاروقی مردوں کے متون شعوری اور لاشعوری طور پر تعصب کا شکار ہیں۔

اس دور میں مرد ادیبوں کے ساتھ ساتھ کچھ خواتین ادباء نے بھی تخلیقی میدان میں طبع آزمائی کی جن میں رشیدۃ النساء، محمدی بیگم، عباسی بیگم، صغرا ہمایوں اور نذر زہرا بنت الباقر کے نام بھی شامل ہیں جبکہ ان ناول نگار خواتین میں نذر سجاد اور ان کی سگی پھوپھی اکبری بیگم کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ ان کا ناول "گوڈر کا لال" بہت مشہور ہوا۔ اس دور میں خواتین کی تعلیم کا ذریعہ صرف ادبی رسائل تھے۔ نذر سجاد اپنے تحقیقی مضامین/اور کہانیاں اپنے دور کے مشہور رسائل "خاتون"، عصمت، تہذیب نسواں میں لکھتی تھیں۔ ان کا اصل نام مسرت تنویر جبکہ قلمی نام نذر باقر تھا۔ وہ اس وقت مولوی ممتاز علی کے اخبار "پھول" کی ایڈیٹر بھی تھیں۔ ان کی کہانیاں بڑوں اور بچوں میں یکساں مقبول ہوئیں۔ ان کے مضامین پڑھ کر صوبہ بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم اتنی متاثر ہوئیں کہ انہیں اپنا سیکٹریری بنانے کی پیش کش کی۔ مختلف وجوہات کی بناء پر ان کے والد نے یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ نواب سلطان جہاں بیگم اس صدی کی مشہور خاتون تھیں جن کو اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے تین مدرسے اور ایک کتب خانہ تعمیر کروایا۔ وہ تعلیم کی قدردان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لکھاری بھی تھیں۔ اسی دور کی دوسری مشہور خاتون عطیہ فیضی تھیں جو انگلستان سے تعلیم مکمل کر کے واپس آئیں تھیں۔ اس دور میں جہاں جاہلیت کے بادل منڈلا رہے تھے وہاں پر چند امیر گھرانوں کی خواتین تعلیم کی روشنی سے معمور تھیں۔ عام عورت پر نوآبادیاتی نظام کے تحت دی جانے والی سہولتوں کے باوجود جدید تعلیم کے دروازے بند تھے۔ اسی جہالت نے فرسودہ رسم رواج کو ہوا دی جن میں ذرا سی تبدیلی بھی کئی قسم کی مصیبتوں کا باعث بن سکتی تھی۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین نے اپنی کتاب "سماج اور صنفی تصورات" میں ہندوستان کے اندر پائی جانے والی برائیوں کا ذکر کیا ہے ان کے مطابق:

"کثیر زواجگی نظام، ستی کی رسم، دیوداسی نظام، کم عمری کی شادی، جسم فروشی، پردے کا نظام اور تعلیم و ترقی کے مسائل تک خواتین کیب عدم رسائی نیز صنف پر مبنی سماجی تصورات اسی نظام کی دین قرار دیئے جا سکتے ہیں"(6)

دوسری جنگ عظیم کے بعد تعلیم پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء کا ہدف صرف مردوں کی تعلیم تھا وہ مردوں سے پہلے عورتوں کی تعلیم کے حامی نہ تھے جبکہ نذر سجاد نے عورتوں کی تعلیم کے علاوہ اپنی پھوپھی اکبری بیگم کے ساتھ مل کر ان فرسودہ رسم و رواج کے خلاف اعلان بغاوت بلند کیا اور ہندوستانی معاشرے کی اصلاح ایک نبض شناس کی طرح کی۔ نذر سجاد نے اپنے ناول اور افسانوں کا مرکزی موضوع عورت کی جدید تعلیم کو بنایا۔ اس حوالہ سے قرۃ العین حیدر اپنی کتاب "کار جہاں دراز" میں لکھتی ہیں:

"اکبری بیگم اور ان کی نوعمر بھتیجی نذر زہرا دھما چوکڑی کے کاموں سے اجتناب کرتی تھیں اب انہوں نے توہمات، بدعتوں، قبر پرستی تعزیہ پرستی کے خلاف اعلان جہاد کر دیا"(7)

نذر سجاد نے دوسو کے قریب افسانے اور دس ناول لکھے جن میں "اختر النساء بیگم"، "آہ مظلموں"، "نجمہ"، "حرماں نصیب"، "مذہب و عشق"، "جاں باز" اور "ثریا" مشہور ہوئے۔ ان کے ناول رومانوی انداز لیے ہوئے لکھنوی تہذیب و معاشرت کے عکاس ہیں۔ ان ناولوں کے ذریعے پدرسری معاشرے میں عورت کی سماجی حیثیت اور مقام و مرتبے کا انداز لگانے میں مدد ملتی ہے۔ نذر سجاد کی ہیروین کم عمری میں ہی سنجیدگی لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کی طرح خود ساختہ عورت کا تصور پیش نہیں کیا بلکہ دیوی اور چڑیل سمجھی جانے والی عورت کا متوسط اور معمولی طبقے کی عورت کا روپ پیش کیا۔ ان کا پہلا ناول "اختر النساء" ہے جس کا موضوع عورت کی تعلیم ہے۔ جاہل ماں اپنے بچوں کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ پدرسری سوچ کی حامل عورت ہی عورت کی دشمن ثابت ہوتی ہے اس کا رشتہ خواہ ماں، بہن، ساس اور بیوہ کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی جاہلیت کی وجہ ان کی ذات نہیں بلکہ ان کے حاکم مرد قصوروار ہیں جو ان کو تعلیم حاصل نہیں کرنے دیتے۔ جبکہ جاہلیت کی بناء پر جنم لینے والی فرسودہ رسم و رواج، توہم پرستی اور غیر اخلاقی رویوں نے بھی عورت کو نقصان پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ناول کی ہیروین اپنی سوتیلی ماں کے ظلم و ستم برداشت کرتی ہے گھر سے باہر نکال دیے جانے پر اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر کسی شہزادے گل فام کا انتظار نہیں کرتی بلکہ اپنی زندگی کی خود بناتی ہے۔ نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے اور فرضی نام سے جدید تعلیم حاصل کرتی ہے کیوں کہ اس دور میں لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا جس کی سزا صرف لڑکی کو ہی نہیں بلکہ اس کے خاندان بھی دی جاتی تھی جس کا اظہار اس ناول کی ہیروین اختر النساء ان الفاظ میں کرتی ہے:

"ابا جان صرف اس غرض سے میں نے اپنا نام بدلہ تھا کہ اختر النساء ہونے سے سب پہچان لیں گے کہ میں ہندوستانی مسلمان لڑکی ہوں اور مجھے یہ بات اس لیے پسند نہ تھی کہ ایک مسلمان لڑکی کا آزادانہ طریق سے تعلیم پانا ہماری قوم کی نظروں میں کھٹکے گا اور معیوب سمجھ کر عوام کی نظریں مجھ پر پڑیں گی اور میں تماشا بن جاؤں گی۔ لوگ ہزار باتیں بنائیں گے"(8)

اس نے اپنا نام ستارا رکھا تاکہ لوگ اس کو پارسی لڑکی سمجھ کر حرف گیری نہ کریں۔ اختر النساء نے صرف تعلیم ہی حاصل نہیں کرتی بلکہ ملازمت کر کے خود مختار زندگی گزرتی ہے جبکہ اس زمانے میں عورت کی تعلیم کے بدلے عصمت اور پاک دامنی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ نذر سجاد کے ناول اختر النساء بیگم کی تقلید کرتے ہوئے منشی ارشد تھانوی نے ایک ناولٹ اسی نام سے لکھا تاکہ وہ بھی نذر سجاد کے اس ناول کی طرح شہرت دوام حاصل کرے۔ قرۃ العین حیدر اس سرقے کا انکشاف اپنے مقدمے میں کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"اس زمانے میں رسالوں میں کتابوں پر تبصرے اور تنقیدی مضامین وغیرہ بہت کم چھپتے تھے، چنانچہ بنت نذر الباقر اور ارشد تھانوی کے اس توارد کا کوئی تذکرہ نہ کیا گیا"(9)

شادی انسان کی زندگی کا اہم فیصلہ ہوتا ہے اس کے بارے میں بھی ہمارے معاشرے میں متضاد رویے پائے جاتے ہیں اس سلسلے میں بھی جو حقوق مرد کو دیئے گئے ہیں عورت کو ان سے محروم کیا گیا ہے۔ مرد جتنی مرضی شادیاں کرے کوئی کچھ نہیں کہے گا بلکہ حاکم ہونے کی وجہ سے اس کا حق سمجھا جائے گا۔ ہمارے معاشرے میں طلاق یافتہ اور بیوہ کی دوسری شادی کو بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ "آہ مظلموں" کا موضوع مرد کی دوسری شادی ہے جس میں غلط شادی کے بے ہناک نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس ناول میں عائلی ذمہ داریوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ مرد چار شادیوں کے چکر میں ایک شادی کے فرائض بھی سرانجام دینے سے کوتاہی برتتا ہے۔ پہلی بیوی کو بغیر کسی وجہ کے بے یار و مددگار چھوڑ کر شوہر دوسری کے ساتھ رنگ رنگیاں منا رہا ہوتا ہے اس دوران اسے پہلی بیوی اور بچوں کی ضروریات کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کیوں کی جاتی ہے اگر کرنا اتنی بڑی مجبوری ہے تو پہلی کے حقوق تو کم از کم ادا کیے جائیں۔ شوہر کی اس ناانصافی پر نذر سجاد مزاحمت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"آہ ایسے ظالموں پر آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ کیا زبیدہ اس گھر کی حق دار نہیں۔ یا وہ غریب اس کے بچے نہ تھے ؟ ہائے اس مظلوم پر کیا گزری؟ اس کا تقاضا کرنا مشکل ہے؟"(10)

نذر سجاد کے ناول "نجمہ" میں مغربی تعلیم اور بے جا آزادی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مغربی تعلیم کے غلط معنی نکال کر اس کو فیشن کا نام دیا جا رہا ہے جبکہ مشرق اور مغرب کی بہترین خصوصیات ہی مل کر ایک آئیڈیل معاشرے کو تشکیل دیتی ہیں۔ جمیل کا والد جدید تعلیم کے خلاف تھا اسی لیے اس کو پڑھی لکھی اور بے پردہ لڑکی کا رشتہ قبول نہیں تھا۔ ہمارے ہاں شادیاں بزرگوں کی مرضی سے طے پاتی ہیں۔ شادی کے معاملے میں دونوں فریقین کی رائے جاننا ضروری ہے اس میں مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ پسند کی شادی نہ ہونے کی بناء پر مرد تو آرام سے دوسری شادی کر لیتا ہے مگر عورت ساری زندگی خود کو کوستی رہتی ہے۔ اس ناول میں بھی نذر سجاد دوسری شادی کی مخالفت کرتی ہے نجمہ کا المناک انجام نذر سجاد کی سوچ کا عکس ہے۔

نذر سجاد کے ناول "جاں باز" کا موضوع وطن پرستی ہے۔ عورتیں اپنے وطن کی فلاح و بہبود کے لیے سودیشی تحریک میں حصہ لیتی ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار زبیدہ کا ہے جس میں آئیڈیل لڑکی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ اس ناول کا ہیرو مغربی سوچ کا حامل ہوتا ہے اور ہیروین قوم پرست تھی۔ جب زبیدہ قمر کی سوچ کا پرچار نہیں کرتی تو قمر نجمہ نامی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے مگر نجمہ کی حد سے بڑھی ہوئی آزاد خیالی دونوں میں علیحدگی کا باعث بنتی ہے۔ قمر کی بے اعتنائی کی وجہ سے زبیدہ خود کو حب وطنی کے کاموں میں مصروف کر لیتی ہے نجمہ کے جانے کے بعد زبیدہ قمر کی تنہائی کو دیکھ کر اس سے شادی کر لیتی ہے۔ زبیدہ کو مصنفہ ایک آئیڈیل کردار کے طور پر متعارف کرواتی ہے جو وطن کی آزادی کے لیے مردوں کے ساتھ شریک ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی بھی بڑا ہدف عورتوں کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف مرد کی فطرت سے روشناس کرواتی ہیں جس کو وفا سے زیادہ خوبصورتی سے غرض ہے۔

نذر سجاد کا ناول "حرماں نصیب" بنیادی طور پہ ایک اخلاقی داستان ہے۔ فیروزہ اس کہانی کی ہیروین ہے جو تمام طرح کی نسوانی خوبیوں سے مزین ہے جو اپنی اعلی اور پاکیزہ محبت کی خاطر کسی اور عورت کا گھر نہیں اجڑانا چاہتی تھی۔ نذر سجاد فیروزہ کے اس کردار کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ: "تم سے بے التفائی سے پیش آئی کہ مجھے یقین تھا ملاقات سے تمہاری گذشتہ محبت میں پھر جوش آئے گا اور میں تمہاری اہلیہ کی گنہگار ہوں گی"(11)

ہندو مسلم شادی کے موضوع پر نذر سجاد نے "مذہب اور عشق" کے نام سے ناول لکھا جو نوآبادیاتی دور میں ہند اسلامی تہذیب کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ اس ناول کی ہیروین اعلی تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آتی ہے تو اس کی ملاقات ایک مسلمان لڑکے شبیر سے ہوتی ہے جو سوشیلا کو اسلام سے آگاہی دلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں

وہ کسی بھی مذہب میں نہیں دیئے گئے۔اسلامی حقوق کی ہی ایک شکل جدید تانیثیت/فیمنزم ہے۔یوں اس ناول میں حقوق نسواں اور عورت کے پردے کے بارے میں دیئے گئے احکامات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔پردے کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے وہ لکھتی ہیں:

"اسلامی پردہ میں چہرہ اور ہاتھ پیر چھپانا داخل نہیں ہے علاوہ بریں پردہ کا جو مقصد ہے اس میں مرد اور عورت دونوں کو شریک کیا گیا ہے۔قرآن شریف میں عورتوں کو منہ چھپانے پر زور دینے کی بجائے آنکھیں نیچی رکھنے اور اپنے اوپر شرم وحیا کی کیفیت طاری رکھنے کی تاکید کی گئی ہے"(12)۔

شبیر کی باتوں سے متاثر ہو کر سوشیلا اس سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے وہ معاشرے کے بنائے ہوئے کھوکھلے اصولوں پر اپنی خوشیاں قربان نہیں کرتی بلکہ وہ خاندانی اور معاشرتی مخالفت کو مول لے کر نہ صرف مسلمان ہوتی ہے بلکہ شبیر سے شادی بھی کرتی ہے اس ناول میں جدید عورت کا تصور پیش کیا گیا ہے جو پسند کی شادی ہی نہیں کرتی بلکہ مذہب بھی تبدیل کرتی ہے شادی کے بعد تحریک خلافت میں بھی حصہ لیتی ہے۔

"ثریا" ناول میں بھی نذر سجاد نے پسند کی شادی کو موضوع بنایا ہے۔ثریا کا شوہر اپنے والدین کی مرضی کے بغیر پسند کی شادی کر لیتا ہے۔اس کے گھر والے زبردستی اس کی شادی کسی دوسری جگہ کر دیتے ہیں۔ثریا کی دادی بدنامی کے ڈر سے اس کو لے کر کسی اور جگہ چلی جاتی ہے۔دادی کے انتقال کے بعد ثریا اکیلی رہ جاتی ہے ایک سال بعد نواب کیواں انگلستان سے واپس آتا ہے تو اس کی ملاقات ثریا سے ہو جاتی ہے وہ اپنی پہلی بیوی کو والدین کے پاس چھوڑ کر ثریا سے شادی کر لیتا ہے یوں ثریا اپنی ادھوری زندگی مکمل کرتی ہے۔

نذر سجاد نے اپنے ناولوں میں بے بس اور مجبور عورت کا تصور پیش نہیں کیا بلکہ سماجی رسم ورواج کے بوجھ تلے تنہا رہ جانے والی عورت میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی امنگ پیدا کی جس نے زندگی کو ایک نئے ڈھنگ سے گزارنے کا انداز اپنایا۔تعلیم یافتہ عورت نے ملازمت کی صورت میں خود مختاری حاصل کی۔وہی عورت جو گھریلو کام کاج میں مصروفیات تلاش کرتی تھی جس کو مرد گھر کی چار دیواری میں مقید کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کا رعب وداب رکھ سکے۔وہی عورت اپنے شوہر کی وفات کے بعد ایک ایک کوڑی کی محتاج ہو جاتی تھی ،اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کی محتاج تھی اس کو گھر سے باہر جا کر اپنی محنت کر کے خوددار زندگی کا سبق دیتی ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں پسند کی شادی پر روز دینے کے ساتھ ساتھ زبردستی کی جانے والی شادی کے نقصانات سے بھی آگہی دلاتی ہیں۔اسلام میں عورت کو دیئے جانے والے حقوق سے آگہی ان کے ناول "مذہب اور عشق" میں ملتی ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں ایک ایسی جدید عورت کا تصور پیش کیا ہے جو آزادی نسواں میں اعتدال کی خواہاں ہے حد سے بڑھی ہوئی بے راہ روی کو ناپسند کرتی ہے۔

## حوالہ جات


1۔مبارک علی،ڈاکٹر،تاریخ اور عورت، لاہور،فکشن ہاؤس ،2017ء،ص91۔

2۔نجیبہ عارف،رفتہ وآئینہ(اردو ادب کا منظر نامہ)،اسلام آباد پورب اکادمی،2008ء،ص55۔

3۔وہاب اشرفی،ڈاکٹر،عالمی تحریک نسائیت مضمرات وممکنات،ایجوکیشنل پبلشنگ،دہلی،2012ء،ص221۔

4۔روش ندیم،ڈاکٹر،منٹو کی عورتیں،اسلام آباد،پورب اکادمی،2009ء،ص58۔

5۔روبینہ سہگل،قوم پرستی،عسکریت اور صنفی تقسیم،لاہور،فکشن ہاؤس،2011ء،ص87۔

6۔آمنہ تحسین،ڈاکٹر،سماج اور صنفی تصورات(ادب کے آئینے میں)،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ،2019ء،ص75۔

7۔قرۃ العین حیدر،کار جہاں دراز ہے،لاہور،سنگ میل پبلشرز،2010ء،ص152۔

8۔نذر سجاد،ہوائے چمن میں خیمہ گل،مرتبہ قرۃ العین حیدر،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2004ء،ص257۔

9۔نذر سجاد،ہوائے چمن میں خیمہ گل،مرتبہ قرۃ العین حیدر،دہلی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2004ء،ص38۔

10۔ایضا،ص34۔

11۔ایضا،ص349۔

12۔ایضا،ص104۔